ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
Volume 3, Issue 2, (April to June2022)

ماخذ تحقیقی مجلہ

ڈاکٹر سید عون ساجد نقوی
اسسٹنٹ پروفیسر، وفاقی اردو یونیورسٹی، اسلام آباد
ڈاکٹر مجاہد عباس
اردو لیکچرر، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

نو آبادیاتی تناظر میں میرؔ اور غالبؔ کے طرزِ احساس پر ایک نظر

Dr. Syed Aoun Sajid Naqvi
Assistant Professor, Federal Urdu University, Islamabad.
Dr. Mujahid Abbas
Lecturer, NUML, Islamabad.

Colonial Review of Mir and Ghalib's Intellectual Perspectives

Mir and Ghalib are the cultural metaphores of Urdu literature.Both have observed the downfall of Indian civilization during the colonial period of East India Compnay.They raised their poetic voices to explain the weeknesses of local political systems and dispersal of values in social setup. They have also recognized the evils in the minds of colonialists as they were planning for the cultural invasion of whole subcontinent. Mir has pessimistic approach in his poetry as he was observing the storm of darkness that was about to prevail everywhere. So, he has found only one way to save his identity by hiding his selfness in Sufism. It can be said that Mir has handed over his identity to the super power of the nature and this was the uncounsious reaction of his intellect. On the other hand, Ghalib has observed this invasion with his eyes. He has written many stories in his letters. His intellect was one step ahead from the Mir as he has not given up his identity till the end. He has taken the support of the Sufism and super power of the nature, but he has kept his intellect as his separate identity. In this article, it is tried to differniate the pattern of feelings of both classic figures Mir and Ghalib with reference to the colonial aspects.

Keywords: *Mir, Ghalib, Tarz, Ahsas, Nouabadiyat, Tehzeb.*

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
Volume 3, Issue 2, (April to June2022)

ماخذ تحقیقی مجلہ

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ تہذیبی یلغار کے نتیجے میں مقامی تہذیب میں تین طرح کے ردِ عمل فوری دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اول اول ایک ایسا طبقہ پیدا ہو جاتا ہے جو طاقتور تہذیب کی حمایت کرنا شروع کر دیتا ہے۔ اس کی ایک وجہ شاید یہ ہو سکتی ہے کہ وہ اپنی تہذیبی شکست اور دوسری تہذیب کی بالا دستی کا قائل ہو جاتا ہے۔ مرعوبیت کے علاوہ دوسری وجہ اس طبقے کی مفاد پرستی بھی ہو سکتی ہے۔ ہو سکتا ہے اس طبقے کو مقامی تہذیب کے دوسرے طبقات نے پہلے سے ہی دبایا ہوتا ہے اور اب وہ مقامی اور پہلے سے حاوی طبقات سے بدلہ لینے کی کوشش کرتا ہے۔ دوسرا ردِ عمل مزاحمت کی صورت میں جنم لیتا ہے۔ یہ مزاحمت صرف فکری یا تہذیبی عصبیت کی سطح پر نہیں ہوتی بلکہ اس کا عملی اظہار بھی جنگوں اور حملوں کی صورت میں مشاہدے میں آتا ہے۔ اگر طاقتور تہذیب مکمل غلبہ پالے تو مقامی تہذیب کے مزاحمتی طبقات کے اعصاب کس دیے جاتے ہیں تاکہ غلبے کو طول دیا جا سکے۔ تیسرا ردِ عمل سرمئی حلقے کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ یہ ردِ عمل تہہ نشیں موج کی طرح خاموش مگر رواں رہتا ہے۔ اس طرح کا ردِ عمل ظاہر کرنے والے طبقات کچھ دیر کے لیے تردد اور تذبذب کا شکار ہو جاتے ہیں۔ وہ مفاہمت یا مزاحمت کا فوری فیصلہ نہیں کرتے ہیں۔ وہ شعوری اور لاشعوری حوالوں کے درمیان ایک خاص وقت تک کے لیے معلق ہو جاتے ہیں۔ اسی دوران ان طبقات سے تعلق رکھنے والے لوگ اپنے داخل اور خارج کا مکالمہ سن سکتے ہیں جس کے نتیجے میں انہیں اپنی شناخت کے بنیادی سوال کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہی کہانی ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے توسل سے نوآبادیاتی تناظر میں مغربی تہذیب کی یلغار اور ہندوستانی تہذیب کے انتشار کی ہے۔ ہندوستان میں بھی تینوں طرح کے ردِ عمل دیکھنے کو ملے۔ ایک طبقے نے انگریزوں کی حکمرانی کو خوش آمدید کہا اور ان کا آلہ کار بن کر کارِ سرکار سے حظ اٹھانے لگا اور ذہنی غلام بن گیا۔ اس طبقے کی پیدائش میں جہاں مقامی لوگوں کا احساسِ کمتری شامل تھا وہیں حکمران طبقے کے سوچے سمجھے منصوبے بھی شامل تھے۔ اسطرح کے ایک منصوبے کی طرف ڈاکٹر ناصر عباس نیر نے لارڈ مکالے کی تعلیمی رپورٹ کو سامنے رکھتے ہوئے اشارہ کیا ہے۔

> "فی الوقت ہماری بہترین کوششیں ایک ایسا طبقہ معرضِ وجود میں لانے کے لیے وقف ہونی چاہیں جو ہم میں اور ان کروڑوں انسانوں کے مابین، جن پر ہم حکومت کر رہے ہیں، ترجمانی کا فریضہ سرانجام دے۔ یہ طبقہ ایسے افراد پر مشتمل ہو جو رنگ و نسل کے

لحاظ سے تو ہندوستانی ہو لیکن ذوق، ذہن، اخلاق اور فہم و فراست کے اعتبار سے انگریز۔"(۱)

دوسرا طبقہ مزاحمتیں کرتا ہوا درختوں کے ٹہنوں کے ساتھ پھانسیوں پر جھولتا رہا اور قید وبند کی صعوبتوں میں صبح و شام سے بے خبر رزقِ قبر بنتا رہا۔"دلی کی آخری بہار" کے مقدمے میں ضمیر حسن دہلوی نے اس طبقے کے ساتھ پیش آنے والے سلوک کی نشاندہی یوں کی ہے:

"کوتوالی جبوترے پر پھانسیاں گڑ گئیں اور چن چن کر مسلمانوں کو دار پر چڑھا یا گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے شہر میں ہو کا عالم ہو گیا ویرانوں میں کتے لوٹنے لگے۔ بازار۔۔۔۔مسمار کر دیے گئے۔ امیر امرا کی حویلیاں ڈھا دی گئیں اور دفینوں کی تلاش میں دلی پر گدھوں کے ہل چلوا دیے گئے۔ بادشاہ پر لال قلعے میں مقدمہ چلا اور انہیں قید کر کے رنگون بھیج دیا گیا۔ لال حویلی کی کوکھ جل گئی۔ گورا فوج قلعہ میں رہنے لگی۔"(۲)

تیسرا طبقہ بے بسی کے عالم میں تردد کا شکار ہو کر اپنی تہذیبی شناخت کے پرزے تلاش کرتا رہا۔ میر و غالب کا تعلق اسی تیسرے طبقے سے ہے لیکن ان کے طرزِ احساس میں ایک نمایاں فرق ہے جسے ہم اس آرٹیکل میں پیش کر رہے ہیں۔

میرؔ غالبؔ کے پیش رو تھے۔ میرؔ نے بدیسی تہذیب کے دیو کی آہٹ سن لی اور ساتھ ساتھ مقامی تہذیب کے انتشار کی نشانیاں بھی دیکھ لیں۔ یہی وجہ ہے کہ میرؔ کے ہاں "شام" کا استعارہ ان کے عصری کرب کا نمائندہ بن جاتا ہے جس کے بعد رات کا اندھیرا تہذیب کا مقدر ہو جاتا ہے۔ "شام" سے جڑے تمام تلازمے پھر میرؔ کے احساس کی فضابندی کرتے ہیں۔ یوں میرؔ کی شاعری ایک آسیب کی آمد کا اعلان بن جاتی ہے۔ ایک دیو کے سائے کا سندیسہ اور ایک مہیب خوف کے سرایت کرنے کی خبر سی لگتی ہے۔ آسیبی آہٹ سن لینے کے بعد وہ چاہتے ہیں کہ سب کو اس احساس سے آگاہ کریں مگر وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ اس سیلابِ بلا کا رکنا اب محال ہے۔

آگہ تو رہیے اس کی طرزِ رہ و روش سے
آنے میں اس کے لیکن کس کو خبر رہے ہے

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
Volume 3, Issue 2, (April to June2022)

ماخذ تحقیقی مجلہ

دلی کے نہ تھے کوچے اوراقِ مصور تھے
جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی

دلی میں آج بھیک بھی ملتی نہیں انہیں
تھا کل تلک دماغ جنہیں تاج و تخت کا

ہم گشتگانِ عشق ہیں ابرو چشمِ یار
سر سے ہمارے تیغ کا سایہ نہ جائے گا

ہم رہروانِ راہِ فنا ہیں برنگِ عمر
جاویں گے ایسے کھوج بھی پایا نہ جاوے گا

کن نیندوں اب تو سوتی ہے اے چشمِ گریہ ناک
مژگاں تو کھول شہر کو سیلاب لے گیا

اس طرح میرؔ کے طرزِ احساس کا پہلا حاصل ہندوستانی تہذیب کے روبہ زوال ہونے کا سراغ ہے۔ لیکن میرؔ کے ہاں اس احساس کی شدت اس قدر زیادہ ہے کہ وہ بغیر توقف تہذیبی شکست کے المیے کا اعلان دلوں کے درمیان مکالموں میں شروع کر دیتے ہیں۔ وہ تہذیب کا سوگ مناتے ہیں اور جل بجھی تہذیب کی راکھ اپنے دل میں چھپا لیتے ہیں اور خود بھی اسی راکھ اور غبار میں گم شدہ میراث کی صورت اختیار کر جاتے ہیں۔ اس طرح وہ اپنی تہذیبی شناخت اور شکستِ ذات کے دونوں سوالوں کا جواب خود بن جاتے ہیں۔ میرؔ کی دلی اس کی ذات کی شناخت بھی تھی اور اس کی تہذیب کی بھی۔ اسی دلی کی حالتِ زار کا نقشہ حامد اللہ افسر نے یوں کھینچا ہے۔

"مکان پہچانے نہیں پڑتے، مکینوں کا پتا نہیں، گھر بیٹھے ہوئے، دیواریں شکستہ، محلے خراب، کوچے نایاب، وحشت ہویدا، انس ناپیدا"(۳)

میرؔ کا یہ طرزِ احساس اب ادراکِ ذات میں بدل کر ان پر تخلیقی دنیاؤں کے در کھول دیتا ہے۔ جہاں اب انہیں استغراقِ عشق و جنوں کی ماورائیت اور وسعت میسر آجاتی ہے۔ وہ راکھ اب میلوں تک اڑ کر ہمہ گیری اور

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
Volume 3, Issue 2, (April to June2022)

ماخذ تحقیقی مجلہ

آفاقی منزلوں کی طرف سفر شروع کر دیتی ہے۔ علوئے نفسی اور دور اندیشی کی بدولت دنیاوی غم و غصہ و خوشی و انبساط اب شانِ بے نیازی کی نذر ہو جاتے ہیں۔ اب وہ عشقِ آتش گیر کی راکھ میں احساسِ گم شدگی کے دوران اپنے معدوم ہوتے وجود کی ادراکی لذت سے سرمستی و سرخوشی اور شوریدہ سری کو ایک بنا سکتے ہیں۔ اسی تناظر میں خواجہ احمد فاروقی نے میرؔ کی شخصیت کو اس طرح بیان کیا ہے:

> "ان کی شخصیت، دلِ پرخوں کی گلابی سے سرشار ہے۔ ان کی آواز امرت میں ڈوبی ہوئی ہے۔ ان کا غم روایت نہیں، زندگی کی صداقت ہے۔ یہ محض اپنا غم نہیں، اپنے طبقہ اور اپنے تمدن کا بھی غم ہے۔ اس وقت پرانا نظام پارہ پارہ ہو رہا تھا۔ قدیم تہذیب کے صحیفے کے ورق بکھرے پڑے تھے۔ میر نے ان کو کلیجے سے لگایا، آنکھوں سے چوما اور ان کو دل و جگر کے خون سے دوبارہ جوڑا۔ یہ سارا تمدنی ماحول ایک کاموش درد بن کر ان کی غزلوں میں سما گیا۔۔۔ اس منزل پر پہنچ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میر نے سنگِ گرانِ عشق اٹھالیا ہے اور دلِ پُرخوں کی گلابی سے جینے کا ایک ڈھنگ نکال لیا ہے۔"(۴)

اس احساس کے تناظر میں درج ذیل شعر دیکھیے

عالم عالم عشق و جنوں ہے دنیا دنیا تہمت ہے
دریا دریا روتا ہوں اور صحرا صحرا وحشت ہے

یوں مجموعی طور پر میرؔ کا طرزِ احساس انہیں خودی و بیخودی کی دونوں منزلوں سے آگاہ کرتا ہے۔ قبل از وقت تہذیبی زوال کا ادراک اور عاشقانہ تصوف میں راہِ بقا کا وسیلہ انہیں میسر آجاتے ہیں۔ یوں بظاہر تو میرؔ کی کہانی کا اختتام نظر آتا ہے لیکن دشتِ جنوں کی راکھ میں پوشیدہ چنگاری کا واہمہ میرؔ کو مایوسی کا علمبردار رکھتے ہوئے بھی تہہ نشیں امید کا رازداں ضرور بنا جاتا ہے اور اسی چنگاری کی داخلی حرارت آئندگان کے تخلیقی کرب کو تاب بہم پہنچاتی رہتی ہے۔

غالبؔ کا زمانہ میرؔ کے بعد کا زمانہ ہے۔ غالبؔ نے اس آسیب کا سایہ اپنی آنکھوں سے اپنے شہروں پر پڑتے دیکھا جس کی خبر میرؔ نے دی تھی۔ اس لیے غالبؔ کا تجربہ میرؔ کے خوف سے تھوڑا منفرد نکلا۔ غالبؔ جذباتی اور

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
Volume 3, Issue 2, (April to June2022)

ماخذ تحقیقی مجلہ

مادی سطح پر تو میرؔ کا ساتھ دیتے ہیں لیکن یہ دیوانگی کی بجائے فرزانگی کی راہ پر چل پڑتے ہیں۔ جہاں غالبؔ کے حواس معطل نہیں ہوتے۔ وہ اپنی شکست کی آواز سن سکتا ہے۔

نہ گلِ نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز
میں ہوں اپنی شکست کی آواز

یا

شق ہو گیا ہے سینہ خوشا! لذتِ فراغ
تکلیفِ پردہ داریِ زخمِ جگر گئی

یا

رگ وپے میں جب اترے زہرِ غم پھر دیکھیے کیا ہو
ابھی تو تلخیِ کام و دہن کی آزمائش ہے

جب غالبؔ ذاتی اور تہذیبی شناخت کے مسئلے سے دوچار ہوتے ہیں تو وہ میرؔ کی طرح اس کا فیصلہ بہت جلد نہیں کرتے بلکہ کچھ عرصہ تہذیبوں میں توازن کرتے ہیں۔ اپنی ذات کی پہنائیوں اور تہذیب کی گہرایوں میں شکستگی کے اسباب ڈھونڈتے ہیں۔ جہاں انہیں خود کلامی کی نعمت ملتی ہے اور وہیں سے انہیں چارہِ سوزِ دل میسر آجاتا ہے۔۔ اگرچہ خارج میں گھپ اندھیرا یا "مہیب رات" کا پہرہ ہے لیکن وہ اپنے حصے کا چراغ ضرور جلاتے ہیں۔ ذاتی سطح پر وہ نو آبادکاروں کے لیے اتنی بھی اہمیت نہیں رکھتے تھے کہ انہیں ان کے آباؤاجداد کی وراثت میں سے مکمل حصہ دے دیا جاتا۔ اس کے لیے انہوں نے متعدد بار درخواستیں دیں، مقدمات لڑے، کلکتہ تک کا سفر کیا مگر بے سود اور تہذیبی سطح پر ان کا مشاہدہ انہیں طاقت کے منابع سے مسلسل آگاہ کرتا رہا۔ اگرچہ بظاہر اس یاسیت زدہ ماحول میں اعصاب شکنی ہر ذی شعور کا حصہ بنی مگر غالب کی دور اندیشی نے انہیں حصار عطا کیا۔ یوں وہ اپنے خیال کے پیکر سے تمناؤں کی بیکراں وسعتوں کی طرف ایک روزن کھولنے کے قابل ضرور ہو جاتے ہیں۔

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
Volume 3, Issue 2, (April to June2022)

ماخذ تحقیقی مجلہ

میرؔ کے پہلے تجربے کی طرح غالبؔ بھی شکستِ ذات کی منزل کے راہی نظر آتے ہیں جہاں ایک عہد مسمار ہو رہا ہے اور ایک تہذیب تاریخ میں بدل رہی ہے۔ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے اس عہد کے بارے میں لکھا ہے:

> "غالب کی شعری شخصیت کی شکست و ریخت، واماندگی، اضمحلال اور ریاست کا تعلق اگرچہ اس کی اپنی ذات سے ہے مگر ذات سے بڑھ کر ان کا تعلق ان کے عہد کے ساتھ ہے۔"(۵)

داغِ دل کے گہرے ہونے کے سبب غالبؔ بھی اپنی ذات کو سر چشمہِ بقا تک ضرور لے جاتے ہیں لیکن سپردگی کی بجائے انانیت کا لباس پہن لیتے ہیں اور یہیں سے اپنی شناخت کی چنگاری چرا لیتے ہیں۔ اجتماعی سطح پر وہ تہذیبی نرگسیت کا شکار نہیں ہوتے بلکہ تہذیبی نفسیات کی الجھنوں کو نشان زد کرتے ہیں اور انفرادی سطح پر اپنی انا کا علم بلند کر کے امر ہو جاتے ہیں۔

دکھاؤں گا تماشا دی اگر فرصت زمانے نے
مرا یہ داغِ دل، اک تخم ہے سروِ چراغاں کا

یا

اپنی ہستی ہی سو ہو جو کچھ ہو
آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی

اس پوری بحث کا حاصل یہ ہے کہ میرؔ و غالبؔ انسانی جذب و کیف اور مادی وجود کی طلب کی منزلوں تک ایک ساتھ چلتے ہیں۔ پھر دونوں ذات اور تہذیب کی شناخت کے المیے سے دوچار ہوتے ہیں۔ اور دونوں ہی عشق کی راہ پر چل پڑتے ہیں۔ البتہ یہاں سے دونوں کی راہیں جدا ہو جاتی ہیں۔ میرؔ عاشقِ دیوانہ بن کر تصوف کے اس راستے پر خود کو گم کر دیتے ہیں جہاں حیرت، راکھ، غبار، یاسیت، قنوطیت اور فنا سب ایک ہی فضا ترتیب دیتے ہیں۔ جہاں ذات کی سپردگی و گمشدگی ہے یا پھر صرف تہہ نشیں چنگاری۔ یہی وجہ ہے کہ میرؔ کے ہاں حزن و ملال، زبان کی نرمی و گھلاوٹ، کم نمائی اور دھیما پن ملتا ہے۔ جبکہ غالبؔ عاشقِ فرزانہ بن کر تصوف کے ایسے راستے پر نکل جاتے ہیں جہاں تمناؤں، آرزوؤں، خوابوں، چراغوں اور امیدوں کا ایک جہان آباد ہے جہاں غالبؔ اپنی انانیت کا پرچم لہراتے ہیں اور

میر کی چنگاری سے شعلۂ عشق بنا کر روشنی کا مینار تخلیق کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے غالب کے ہاں تمنائی فکر، خود اعتمادی اور بذلہ سنجی نظر آتی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ ناصر عباس نیر، مابعد نو آبادیات اردو ادب کے تناظر میں، اوکسفورڈ یونیورسٹی پریس، کراچی، ۲۰۱۳، ص:۱۲

۲۔ ضمیر حسن دہلوی، مقدمہ: دلی کی آخری بہار از راشد الخیری، اردو اکادمی، دہلی، ۱۹۸۷، ص:۲۶

۳۔ حامد اللہ افسر، میر کی شاعری، مشمولہ دلی کالج میگزین (میر نمبر)، شعبہ اردو دلی کالج، کوہِ نور پریس، دلی، ۱۹۶۲، ص:۱۶۳

۴۔ خواجہ احمد فاروقی، شہر میر، مشمولہ "آج کل" شمارہ ۸، مارچ ۱۹۸۴،

۵۔ تبسم کاشمیری، اردو ادب کی تاریخ، سنگِ میل پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۰۹، ص:۲۶۷